مولانا محمد حنیف ندوی

# اقتصادیات میں اسلام کا موقف

## (۲)

### نظام سرمایہ داری کے اصولی نقائص

سرمایہ دارانہ نظام میں اصولی نقائص کیا ہیں اور کن وجوہ اور اسباب کی بنا پر پہلے ہی قدم پر یہ مسترد کر دینے کے لائق ہے۔ اس کو جاننے کے لئے ہمیں فکر و تدبر کو خصوصیت سے ان نکات پر مرکوز رکھنا چاہیے۔

۱- سرمایہ دارانہ نظام کی روح نفع اندوزی ہے، اس کے دائرۂ کار میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ معاشرہ میں عدل و انصاف کی قدروں کو رائج کیا جائے یا اس تضاد و اختلاف کو رفع کیا جائے جس کی بدولت انسان دو حریف طبقوں میں تقسیم ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی اصل غرض و غایت سرمایہ کو بڑھانا اور ایک خاص طبقے کے لیے زیادہ سے زیادہ آسائشوں کو مہیا کرنا ہے۔ اس میں اگر نام نہاد اصلاحات کی طرف بدرجہ مجبوری کوئی قدم اٹھتا بھی ہے تو اس لیے نہیں کہ اُس سے اس غیر انسانی تفریق کو ختم کیا جائے جس نے انسانوں کے جمِ غفیر سے راحت و سکون کی دولت چھین رکھی ہے۔ ان کی تہ میں یہ مقصد کار فرما ہوتا ہے کہ اس طبقہ میں جو ایک طرح کا احساسِ ظلم یا محرومی پایا جاتا ہے وہ کم ہو اور یہ پہلے سے زیادہ محنت اور زیادہ جانفشانی سے کام کریں تاکہ پیداوار کا تناسب بڑھے اور اس کے ساتھ ان کی دولت و ثروت کے ذخائر میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہو۔

اس نظام میں اصلاحات کا معیار چاہے کتنا ہی اونچا ہو جائے، یہ ناممکن ہے کہ یہ حدودِ عدل کو چھو سکے، وہ انسانیت کے ہمہ گیر اصولوں تک رسائی حاصل کر سکے۔ مزدور و سرمایہ دار میں جو غیر فطری دوری اور فاصلہ ہے اس کو دُور کرنا اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس کی بنیاد، جڑ اور فطرت میں یہ بات رچی بسی ہے کہ انسانوں کو ظالم و مظلوم، بالادست اور زیر دست، یا استحصال کرنے والے اور

استحصال کا شکار ہونے والے دو کیمپوں میں تقسیم کیے رکھے۔ اسی میں اس کی زندگی کا راز مضمر ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اگر معاشرہ میں فرق و امتیاز کے یہ فاصلے مٹ جاتے ہیں تو سرمایہ دارانہ نظام کے لیے وجہ جواز بھی کیا باقی رہ جاتی ہے؟

۲۔ اس نظام میں جو جذبہ تحریک پیدا کرتا ہے وہ یہ ہے کہ کن ذرائع و وسائل سے دولت آفرینی کے دائروں کو وسیع سے وسیع تر کیا جا سکتا ہے۔ اس وجہ سے سرمایہ داری کی ہر ہر سطح میں اس تضاد اور استحصال کا رہنا ضروری ہے جو انسانوں کو دو مستقل خانوں میں بانٹ دے۔ یہ صحیح ہے کہ بعض اصلاحات سے مغربی ممالک میں مزدور کا معیار زندگی خاصا بلند ہو گیا ہے اور وہ قریب قریب ان تمام تحفظات اور آسائشوں سے بہرہ مند ہے، جس سے مڈل کلاس بہرہ مند ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہ نہیں کہا جا سکتا کہ استحصال کا پوری طرح قلع قمع ہو گیا ہے اور وہ طبقہ معاشرہ میں باقی نہیں رہا جو اپنے دامن حرص و آز میں زیادہ نفع ڈال لینے کا متمنی ہے۔ اور اس سے تہذیب و ثقافت کی وہ دوئی ختم ہو گئی ہے جو لاکھوں اور کروڑوں روپوں کی آمدن سے پیدا ہوتی اور ابھرتی ہے۔ اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ اجارہ داری کی صورت میں سرمایہ کا کردار نسبتاً اجتماعیت اختیار کر لیتا ہے اور جب یہ اجارے مل کر ایک کلیت (CARTEL) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں تو ان میں کسی حد تک اشتراکیت کی خو پیدا ہو جاتی ہے۔ یہی سرمایہ اب انفرادی مصالح کے بجائے اجتماعی مصالح کے تابع ہو جاتا ہے اور اس کی تنظیم اور منصوبہ بندی میں زیادہ وسیع تر مفادات کا خیال رکھا جاتا ہے۔ لیکن فکر و نظر کا یہ دھوکا ہے۔ اس تبدیلی کے معانی عملاً صرف یہ ہیں کہ پہلے اگر ایک فرد کا استحصال محدود اور سمٹا ہوا تھا تو اب بہت سے لوگوں نے مل کر اس کی طاقت و قوت میں بیش بہا اضافہ کر دیا ہے یعنی اب اس کا دائرۂ اثر و نفوذ صرف اپنے ہی ملک کے مزدوروں تک وسعت پذیر نہیں رہا۔ بلکہ سوچا یہ جا رہا ہے کہ کس پس ماندہ ملک کے ذرائع دولت تک رسائی حاصل کی جائے۔ سرمایہ کاری اور سرمایہ داری کا یہی وہ مرحلہ ہے جہاں سے منحوس مستعمرانہ دور کا آغاز ہوتا ہے۔ اور اس طرح سرمایہ دارانہ نظام کے نشو و ارتقا کو نئی قوت اور نیا کس بل مل جاتا ہے۔

خود اس فلسفۂ حیات میں زندہ رہنے اور معاشرہ کے تضادات کو حل کرنے کی کس درجہ صلاحیت ہے۔ عام لوگوں کو اس کا صحیح صحیح اندازہ اس وقت ہو گا جب مشرق کلیتاً مغرب کے استعماری دائرے سے باہر نکل آئے گا۔ جب بیرون ملک کے تمام استحصالی ہتھکنڈے بیکار ہو جائیں گے۔ اور ہر ہر

ملک اپنی اقتصادیات کو آزادانہ اپنی استطاعت کے مطابق خود ترتیب دے گا۔ اور ہر ہر قوم مجبور ہو جائے گی کہ اپنے ہی ذرائع پر قناعت کرے۔ جب تک یہ نہیں ہو پاتا اور مغرب کی بالادستی قائم رہتی ہے مغرب کے برژوائی حکما خود بھی اس غلط فہمی میں مبتلا رہیں گے اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا رکھیں گے کہ یہ سرمایہ دارانہ نظام ہی کا کرشمہ تو ہے کہ امریکہ، برطانیہ اور فرانس میں مزدوروں کا معیارِ زندگی خاصا اونچا ہے اور ان کو وہ تفوق حاصل ہے جس کی نظیر اشتراکی ممالک میں نہیں ملتی۔ سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ کیا اس لیے کہ یہ فلسفہ اور یہ نظامِ حیات صحیح ہے یا اس لیے کہ ان قوموں کو استعماری ٹھیکیداروں کی بدولت استحصال کے جو بے شمار مواقع حاصل ہیں وہ دوسروں کو حاصل نہیں۔

۳۔ فنی طور پر بنیادی نقص اس نظامِ معیشت میں یہ ہے کہ آغازِ کار سے لے کر نشو و ارتقا کے ہر ہر موڑ تک اس کو مسلسل ناہمواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہموار اقتصادیات سے ہماری مراد یہ ہے کہ دولت کی تقسیم اور منصوبہ بندی، کسی قوم یا ملک کی ضروریات اور تقاضوں کو ملحوظ رکھ کر کی جائے یعنی جہاں اور جس جس مد پر قومی و ملی مصالح کے پیشِ نظر زیادہ خرچ کرنا ضروری ہو، وہاں زیادہ خرچ کیا جائے اور جو تقاضے قومی اور ملی نقطہ نظر سے یا انسانی فلاح و بہبود کے لحاظ سے کم تر درجہ کے حامل ہوں ان پر اسی نسبت سے کم توجہ صرف کی جائے۔ لیکن سرمایہ دارانہ نظام میں ایسا ہونا ممکن نہیں اس کی بنیاد چونکہ ملی و انسانی مصالح کے بجائے نفع اندوزی و نفع آفرینی پر ہے۔ اس لیے اس میں ہمیشہ دیکھا یہ جاتا ہے کہ کون مد زیادہ سے زیادہ افزائشِ دولت کا باعث ہو سکتی ہے۔ فرض کیجیے ضروریاتِ زندگی کے مقابلہ میں تعیشات تخلیق و آفرینش کی حوصلہ افزائی زیادہ نفع آور ثابت ہوتی ہے۔ یا آلاتِ حرب و ضرب کی برآمدات سے وارے نیارے ہونے کا امکان ہے تو ملک کے کارخانے تکلفاتِ زندگی کی تیاری یا ہلاکت آفریں اسلحہ کی فراہمی میں ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اور رات دن انہی اغراض کی تکمیل کے لیے کام کرنے پر مجبور رہوں گے اور جو ملک و قوم کی تعلیم، تہذیب اور ترقی کے لیے ناگزیر ہیں یا نوعِ انسانی کی حقیقی فلاح و بہبود پر منتج ہو سکتے ہیں، تو ان کو نہایت آسانی سے نظر انداز کر دیا جائے گا۔ سرمایہ دارانہ نظام میں اس نوع کی ناہمواری کا پایا جانا لازمی امر ہے۔ اس کا ثبوت طلب کرنا ہو تو امریکہ، برطانیہ یا فرانس کا کوئی سا میزانیہ اُٹھا کر دیکھ لو۔ تمہیں پتہ چل جائے گا کہ بناؤ سنوار کے غیر ضروری تکلفات یا جنگی برآمدات کی تیاری کی مد پر کتنا صرف کیا جاتا ہے اور انسانی صحت، خوراک

رہائش، تعلیم اور تہذیب و تمدن کی آسائشوں پر خرچ کا تناسب کیا ہے؟ اور دنیا میں امن و عافیت کے دواعی کو تقویت دینے اور علوم و فنون کے قافلوں کو آگے بڑھانے پر کیا خرچ کیا جاتا ہے اور کرۂ ارض کا گلا گھونٹ دینے والی مساعی و تحقیق کے بارہ میں کس فیاضی اور بے دریغی سے صرف کیا جاتا ہے۔

۴۔ فلسفیانہ لحاظ سے اس نظام کا تعلق تصوریت سے ہے اور اس اعتبار سے اقدار و اخلاقیات کو اس میں کسی نہ کسی حد تک مستقل بالذات مقام حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن ستم ظریفی اور تضاد ملاحظہ ہو کہ اس میں اصل مقام روپیہ اور دولت کو حاصل ہوتا ہے اور روپیہ جو محض تبادلہ اشیا کا ذریعہ ہے، سرمایہ دارانہ معاشرہ میں بجائے خود ایک قدر ( VALUE ) اور خوبی کا روپ دھار لیتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی شخص کی قیمت یا درجہ اس سے متعین نہیں ہو پاتا کہ اس میں معاشرہ کو ترقی دینے، آگے بڑھانے اور تہذیبی اعتبار سے جلا دینے کی صلاحیتوں کا کیا عالم ہے؟ یا اس کے دست ہنر پرور میں تخلیق و آفرینش کے کیا کیا اعجاز پنہاں ہیں؟ یا کسی دانشور اور عالم کا وجود معاشرہ کی روحانی و ذہنی تعلیم و تربیت کے لیے کس درجہ ضروری ہے؟ یا ذاتی طور پر اس میں کون کون وہ اخلاقی فضائل پائے جاتے ہیں جن سے معاشرہ استفادہ کر سکتا ہے۔ بلکہ مقام و منصب کا تعین اس سے ہوتا ہے کہ اس کے پاس کس درجہ دولت کی فراوانی ہے۔ یہ آراستہ و پیراستہ بنگلہ میں رہتا ہے، یا کچے مکان اور پھوس کے جھونپڑے میں رہ رہا ہے۔ اس کا بنک بیلنس کتنا ہے۔ یہ کار پر چل کر آتا ہے یا ساری مسافتیں پیدل ہی چل کر طے کرتا ہے! اور اسی معیار سے معاشرہ میں پذیرائی اور حوصلہ افزائی کے امکانات ابھرتے ہیں۔ حتیٰ کہ خالص دینی مجالس میں بھی جہاں اصولاً تمام فیصلوں کو صلاحیت کار اور عمل کے لحاظ سے طے ہونا چاہیئے، ہوتا یہ ہے کہ صدارت، نظامت اور دیگر اختیارات کی ریوڑیاں گھوم پھر کر ان ہی میں تقسیم ہوتی رہتی ہیں جو سرمایہ دار ہیں اور ان کے مقابلہ میں نہایت ہی نیک، مخلص اور سمجھدار لوگوں کو اس بنا پر نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ ان کے دامن پہ غربت و افلاس کے بدنما داغ، دھبے نمایاں ہیں۔ یہ اس غلط نظام کا کرشمہ ہے۔ معاشرہ کی سرمایہ دارانہ تنظیم میں چونکہ ہر کام سرمایہ ہی کے بل پر انجام پاتا ہے اس لیے انجمنیں اور مذہبی و دینی ادارے مجبور ہیں کہ ان کی سرپرستی و سربراہی کو چار و ناچار قبول کریں۔ غرضیکہ اس نظام میں فضیلت و بزرگی کے پیمانے بدل جاتے ہیں اور معاشرہ کو اس تلخ حقیقت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہی بن پڑتا ہے۔

کہ ہر پر معاملہ میں روپیہ ہی فیصلہ کن عامل ہے اور یہ کہ ایک غریب کی نسبت سرمایہ دار کہیں زیادہ نیک، قابل اور بہتر انسان ہے۔

(۵)۔ سرمایہ دارانہ نظام کے سلسلے میں آخری بات یہ کہی جا سکتی ہے کہ جہاں تک معاشرہ کے ارتقا کے رشتوں کا تعلق ہے یہ ارتقا کی اس منزل تک پہنچ گیا ہے جہاں کسی نظام میں ٹھہراؤ اور جمود کا پیدا ہو جانا بالکل قدرتی امر ہے۔ اس صورت میں یہ کسی نئے فلسفہ کی تخلیق و آفرینش پر قادر نہیں رہتا۔ یہ صحیح ہے کہ جہاں تک سائنس اور ٹیکنالوجی کی فتوحات کا تعلق ہے یہ نظام ان سمتوں میں برابر بڑھتا رہے گا اور علم و فن کے نئے نئے خوارق سے دنیا کو ورطۂ حیرت میں ڈالتا رہے گا۔ لیکن اس نظام نے معاشرہ میں جن نئے رشتوں کو جنم دیا ہے اور ان رشتوں سے تضاد اور ناہمواری کے جو اشکالات ابھرے ہیں، ان کو ختم کر دینے کے لیے اس کے پاس کوئی چیز نہیں۔ کوئی پیغام اور حل نہیں۔ محنت کش طبقہ کی حالت کو سنوارنے کے سلسلے میں یہ بونس، انشورنس برائے نام حصص کی تخصیص یا جزوی تامیم (PART I AL NATIONALISATION) ایسی اصلاحات سے کام لے سکتا تھا اور اصلاح و تدبیر کے جن جن نسخوں کو آزما سکتا تھا وہ آزما چکا۔ آئندہ وہ اس سمت میں کیا قدم اٹھا سکتا ہے اور مزدور و خواجہ کے درمیان حائل اونچی اونچی دیواروں کو کس طرح گرا سکتا ہے، اور عدل، اخوت اور انسانیت کی بنیاد پر کیونکر ایک نئے معاشرہ کی تشکیل کر سکتا ہے؟ اس کا کوئی نقشہ اس کے سامنے نہیں۔ یہ نظام اب فرسودگی کی اس حد کو چھونے لگا ہے جہاں فکر و تجدید کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور زمانہ کے پردۂ ساز سے کسی نئے نغمے اور نئے فلسفۂ حیات کے ابھرنے کا منتظر نظر آتا ہے۔

## جدلی مادیّت کے معنی

سرمایہ داری کے بطن سے جس نئے نظام و فلسفہ نے جنم لیا، اس کا نام اشتراکیت ہے۔ یہ دوسرا متبادل نظام ہے۔ اس کے ہیولے اور ادھورے، یا غیر سائنسی تصوّر کا سراغ پرانی مزدکیت میں ملتا ہے۔ افلاطون نے بھی اس کے خدوخال کی نشان دہی کی ہے مگر اسے ایک منظم فکر کی حیثیت سے پیش کرنے کا سہرا کارل مارکس کے سر ہے۔ لینن اور انگلس کی حیثیت کامیاب شارحین کی ہے۔ ایسے شارحین کی جنھوں نے صرف اس فکر کے گیسوؤں کو سنوارا اور سائنسی قالب میں ڈھالا ہے۔ بلکہ عملاً اس پر مبنی انقلاب میں حصہ بھی لیا ہے۔ اس کے ابہامات کی تشریح و تفصیل بیان کرنے کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ فلسفۂ انقلاب کیا

ہے، کس طرح سرمایہ داری کے قلعوں کو گرایا جا سکتا ہے اور کیونکر اس کے کھنڈرات پر نئے اشتراکی معاشرہ کی تعمیر کی جا سکتی ہے؛ یہ فلسفہ جدلی مادیّت کے اصولوں پر استوار ہے۔ مادّی جدلیت کے معنی، مادیت کی ایسی تشریح کے ہیں جو معقول ہو اور جس کا دائرۂ تحقیق صرف سائنسی انکشافات ہی تک وسعت پذیر نہ ہو، بلکہ جو فکر و عمل کے تمام تضادات کو رفع کرنے کی ذمہ داری بھی قبول کرے۔ یعنی کائنات کے عقدوں کے حل کرنے کے علاوہ، معاشرہ اور تاریخ کی تشکیل نو بھی اس کے دائرۂ کار میں شامل ہو۔ سولھویں اور سترھویں صدی کے آغاز تک مادّیت کے معنی صرف تصوریت کی نفی کے تھے۔ یہ نکتہ صرف کارل مارکس نے دریافت کیا کہ مادّیت کے فلسفہ سے مکمل ضابطۂ حیات وابستہ ہے اور اس کے اصولوں کا اطلاق فلسفہ و معاشرہ پر یکساں ہوتا ہے۔

اشتراکیت اور جدلی مادّیت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اشتراکیت کے مبلغین و شارحین نے کھلے بندوں اس کو تصوریت کے خلاف اس جنگ کا آخری نتیجہ قرار دیا ہے جو صدیوں سے فلسفہ کے ان دو کیمپوں میں جاری رہی اور ابھی ختم نہیں ہو پائی۔ ان کا کہنا ہے کہ اشتراکی معاشرہ اس وقت تک قائم نہیں ہو سکتا، جب تک لوگ مذہبی عقائد و روایت سے بیزار ہو کر خالص مادّیت کو نظریہ حیات کے طور پر قبول کرنے پر مجبور نہ ہو جائیں۔ ان لوگوں کے نزدیک اگر عقل، سائنس اور معاشرہ کے معروضی تقاضوں سے قطع نظر کر کے مابعد الطبیعی اصولوں کو اپنایا گیا تو اس سے سوچ کا دھارا جو رخ اختیار کرے گا اس پر معاشرہ قابو نہیں پا سکے گا، اس کی تنظیم نو نہیں کر سکے گا اور جدید مشکلات کے ٹھیک ٹھیک حل کی طرف قدم نہیں بڑھایا جائے گا کیونکہ اس صورت میں معاشرہ ان اصولوں کی روشنی میں حل تلاش کرنے کی کوشش کرے گا، جو مذہب و دین مہیا کرتا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے زمین کے مسائل زمین ہی پر حل ہونے چاہئیں، آسمان پر نہیں:

قصۂ زمین برسرِ زمین

اشتراکی حکما مذہب کے شدید مخالف ہیں۔ ان کا یہ خیال ہے کہ اس سے رجعت پسندانہ خیالات کی تائید ہوتی ہے اور معاشرہ آگے بڑھنے کی بجائے ماضی کے دھندلکوں میں غائب ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس فلسفہ کی رو سے مذہب کا تعلق تاریخ کی کروٹوں سے ہے۔ ہر ہر دَور کے معاشی و اجتماعی تقاضے اس کو پورا کرتے ہیں اور اس کی غرض و غایت اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنے دَور میں ان تقاضوں سے

سمجھوتہ کرے، قناعت کا درس دے اور انقلابی رجحانات پہ اخلاق، روحانیت اور بلند تر اقدار کے نام سے قدغن اور رکاوٹ عائد کرے۔ ان کے نقطۂ نظر سے تہذیب و ثقافت اور مذہب و دین کی تخلیق و پرورش میں پیداواری ذرائع کو اولیت حاصل ہے۔ ان کے ہاں تاریخ صرف واقعات و حالات کو محفوظ رکھنے کے بے جان ذریعہ سے تعبیر نہیں۔ بلکہ اس کو مستقل بالذات اور انقلاب آفرین معروضی عامل کی حیثیت حاصل ہے، جو معاشرہ کو کسی خاص سانچے میں ڈھالتی اور اس کے خدوخال کو متعین کرتی ہے۔ اسی نے مذاہب عالم کو سطح وجود پہ ابھارا ہے، اور یہی اس کو ختم کر دینے کے درپے ہے۔

جدلی مادیت کے لحاظ سے تاریخ اب ایک ایسے اشتراکی معاشرہ کی متقاضی ہے جس میں عقل اور سائنس کا بول بالا ہو۔ جس میں سرمایہ داری کے تضادات رونما نہ ہوں جس میں ظلم اور استحصال کا قلع قمع ہو جائے، اور ہر انسان کا درجہ اس کی محنت، قابلیت اور کام سے متعین ہو۔

## اشتراکیت کا دنیائے انسانیت پہ احسان

اس فلسفہ کا انسانی معاشرہ اور اس معاشرہ کے غریب عوام پہ سب سے بڑا احسان یہ ہے کہ ان سے سرمایہ دارانہ نظام نے استحصال کے بل پہ ناہموار اور غیر عادلانہ خطوط پہ مبنی جس نظام کی پرورش کی اس کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں اور صاف صاف اس اصول کی تلقین کی کہ جب محنت اور مزدوری کا مزاج اجتماعی ہے اور خواجہ اور مزدور مل جل کر صنعتی تہذیب کو فروغ دیتے ہیں تو یہ کیا بے انصافی ہے کہ نفع و ثمر کی تقسیم کے اختیارات صرف سرمایہ دار کو حاصل ہوں اور اس کی وجہ سے وہ خود تو دولت و ثروت کے تمام ذرائع پہ یکے بعد دیگرے قابض ہوتا چلا جائے اور محنت کش عوام کے مقدر میں صرف صبح و شام کی سوکھی روٹی ہو۔

کارل مارکس نے اس حقیقت کی نقاب کشائی کی کہ جب محنت کش عوام ہی کی تخلیقی کوششوں سے تہذیب و تمدن کی تمام آسائشیں وجود میں آتی ہیں اور جب انہی کے دست ہنر پرور اور جانگسل محنت سے تہذیب و ثقافت کا چہرہ رنگ و روغن اور آب و تاب حاصل کرتا ہے تو ہونا یہ چاہیے کہ تہذیب و ثقافت کی رفاہیتوں اور آسائشوں میں بھی ان کا معتد بہ حصہ ہو۔ یعنی جس تہذیب کو انھوں نے جنم دیا ہے، اس تہذیب میں ان کا ایک مقام اور حیثیت متعین ہونی چاہیے، نہ یہ کہ

یہ خلاق اور ہنر مند ہاتھ تو مفلوج رہیں اور وہ ہاتھ جنھوں نے صرف سرمایہ کی تنظیم کی ہے تعیش و تکلفات کے جام و مینا سے شغل فرماتے رہیں۔

## برژوا حکما کا اندازِ استدلال۔ کیا محنت صرف منفرد عمل ہے۔؟

برژوا حکمانے استحصال کو جائز قرار دینے کے لیے جن دلائل سے تعرض کیا ہے وہ یک طرفہ وکالت پر مبنی ہیں۔ ان کا حاصل یہ ہے کہ سرمایہ دار انتہادرجہ کے ایثار اور قربانی سے پائی پائی جمع کرتا ہے، تب جاکر اس قابل ہوتا ہے کہ کوئی صنعت قائم کرے۔ پھر وہ سرمایہ ہی نہیں لگاتا، بلکہ مکمل منصوبہ بندی بھی کرتا ہے جو اچھی خاصی دماغ سوزی کا کام ہے۔ آلات اور مشینری بھی فراہم کرتا ہے اور نقصان کا خطرہ الگ مول لیتا ہے۔ اس بنا پر اس کو حق پہنچتا ہے کہ اُجرت کا تعین کرے اور زیادہ سے زیادہ نفع حاصل کرے۔ اس طرزِ استدلال میں دو جھول ہیں۔ اول یہ بات خواہ مخواہ فرض کرلی گئی ہے کہ تہذیب و تمدن کی آفرینش، ارتقا اور فروغ میں سرمایہ کو تفوق حاصل ہے۔ دوسرے یہ کہ سرمایہ داری کو تو کئی ابواب اور خانوں میں تقسیم کرلیا گیا، اور ہر ہر خانے اور باب کی علیحدہ علیحدہ قیمت متعین کرلی گئی لیکن اس کے مقابلہ میں مزدوری کو صرف ایک ہی عمل قرار دیا گیا۔ حالانکہ یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ نہ تو تنہا سرمایہ کی کوئی قیمت ہے اور نہ مزدوری ہی غیر مرکب اور وحدانی عمل ہے۔ سرمایہ اور محنت میں رشتہ و تعلق کا کیا اسلوب ہے۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا بہت ضروری ہے کہ سرمایہ اس وقت تخلیقی کردار ادا کرتا ہے جب اس کے ساتھ محنت بھی شامل ہو، اور محنت اس وقت بار آور ثابت ہوتی ہے جب اس کو بروئے کار لانے کے لیے کافی سرمایہ موجود ہو۔

اس میں تفوق و برتری کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا ہے۔ تہذیب و تمدن کی تخلیق و آفرینش، یا بوقلموں پیداواری عمل کا آغاز اس وقت ہوجاتا ہے جب سرمایہ اور محنت مل جُل کر کسی منصوبے کو پروان چڑھاتے ہیں نہ کوئی کارخانہ صرف سرمایہ کے بل بوتے پر چل سکتا ہے، اور نہ صرف محنت تخلیقی عمل انجام دے سکتی ہے۔ ظاہر ہے تخلیق و پیداوار کا یہ عمل سراسر اجتماعی ہے اور چونکہ یہ عمل اجتماعی ہے اس لیے اجرت اور نفع کی تقسیم بھی اجتماعی قاعدہ سے ہونی چاہیے۔ برژوائی فلسفہ اجرت میں سب سے بڑا سفسطہ یہ پنہاں ہے کہ یہ کارخانہ دار کو پہلے ہی قدم پر مالک و خواجہ تسلیم کرلیتا ہے، اور مزدور کو ملازم و بندہ۔ اور ظاہر ہے جب ایک کو خواجہ و مالک ٹھہرایا جائے گا۔ اور دوسرے

فریق کو بندہ و مزدور تو اُجرت کا تعین بہرحال مالک کی مرضی اور مفاد کے تابع ہوگا اور اگر مقدمات کی اس ترتیب کو بدل دیا جائے تو اخذ کردہ نتیجہ بھی اس سے قطعی مختلف ہوگا۔ مثلاً ہم کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ پیداوار اور تخلیق و آفرینش کا عمل سرمایہ اور محنت دونوں کے اتحاد سے رونما ہوتا ہے۔ اس لیے یہ عمل اجتماعی نوعیت کا ٹھہرا جس میں خواجہ و بندہ کی تقسیم منطقی طور پر ناروا ہے۔ اور چونکہ یہ عمل اجتماعی کردار کا حامل ہے اس لیے اجرت و نفع کا تعین بھی اجتماعی سطح پر ہونا چاہیے۔ مقدمات کی اس ترتیب اور صغریٰ اور کبریٰ کے اس انداز سے خواجہ و بندہ کی تقسیم خود بخود بے معنی ہو کر رہ جائے گی۔

آئیے! اب سوال کے اس پہلو پر غور کریں کہ سرمایہ دار کے مقابلہ میں کیا مزدور کا عمل مفرد اور وحدانی ہے یا نہیں۔ دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ جہاں سرمایہ دار ایثار کر کے دولت جمع کرتا ہے، وہاں مزدور بھی افلاس اور بھوک کی کلفتوں کو جھیل کر پہلے ہنر سیکھتا ہے اور کام کو جانفشانی سے انجام دینے کے لیے قوت اور طاقت کی وہ مقدار فراہم کرتا ہے، جو بھاری بھرکم ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے۔ پھر جب وہ کام کرتا ہے اور لوہے اور آگ سے نبرد آزما ہوتا ہے یا بھاری بھرکم مشینوں سے زور آزمائی کرتا ہے تو اس میں اس کی حیثیت بے جان کل پُرزے کی نہیں ہوتی بلکہ اس کے اس عمل میں عقل، تجربہ اور اعصاب کی توانائیاں بھی صرف ہوتی ہیں۔ یعنی وہ ذہن سے بھی کام لیتا ہے، تجربہ اور ہنر سے بھی استفادہ کرتا ہے اور اپنے اعصاب کو بھی گھساتا اور فرسودگی کا ہدف ٹھہرتا ہے جو اس کی عمر اور طاقت کو گھٹا دینے اور طرح طرح کے عوارض کا شکار بنا دینے میں ممد و معاون ثابت ہوتی ہے۔ سرمایہ دار اگر کاروبار میں خسارہ کے اندیشہ سے دوچار ہوتا ہے تو مزدور حقیقتاً جسم و جان کے خسارہ کا سودا کرتا ہے۔ ان حالات میں یہ کس درجہ ستم ظریفی ہے کہ سرمایہ کو تو کئی کئی مدات میں تقسیم کر دیا جائے اور ہر ہر مد کے لیے نفع کا تعین کیا جائے۔ مگر محنت کو صرف وحدانی عمل ہی تصور کیا جائے اور اسی بنا پر اس کی اجرت کا تقرر ہو۔ غرض یہ ہے کہ اشتراکی فلسفہ نے سرمایہ دارانہ نظریہ میں پنہاں اس گھپلے کو بے نقاب کر دیا ہے کہ اجرت اور نفع کا تعین یک طرفہ مصلحت کے تابع ہے، اور یہ کہ استحصالی نظام کے قیام سے عدل و انصاف اور تہذیب و تمدن کی صالح تر قدروں کو قائم رکھا جا سکتا ہے۔ اشتراکیت استحصال کو اس دور کی سب سے بڑی اجتماعی برائی تصور کرتی

ہے اور تقسیمِ دولت کے لیسے نظام کی حامی ہے جس میں معاشرہ کا کوئی فرد کسی بھی شخص کی محنت کا استحصال نہ کرنے پائے۔ اس سے پہلے کہ بحث آگے بڑھے، اس سلسلہ کے اس اہم سوال کا جواب دے دینا بہت ضروری ہے کہ اجرت اور تقسیمِ نفع کی آخر کون صورت منصفانہ سمجھی جاسکتی ہے۔ اس کا جواب اگلی بحثوں میں آئے گا۔

## اشتراکی معاشرہ کی خصوصیات

اشتراکی ریاست کے بارہ میں سب سے پہلے اس حقیقت سے آشنا ہونا ضروری ہے کہ اس کے دروبست پر حکومت کے قابض ہونے کے معنی بیوروکریسی کے قابض ہونے کے نہیں۔ یہ پرولتاری معاشرہ پر مبنی ایک نظام ہوتا ہے جس میں اس بات کو اوّلیت حاصل ہوتی ہے کہ محنت کش عوام کی جسمانی، ذہنی اور فکری صلاحیتوں کی تابش و ضو کا زیادہ سے زیادہ اہتمام کیا جائے اور ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرنے کے علاوہ اس چیز کا بھی خیال رکھا جائے کہ ان کو تہذیبی تگ و دو میں کیونکر برابر کا شریک ٹھہرایا جاسکتا ہے۔ ان کے لیے اول اول معاوضہ کا اصول اس بنیاد پر طے کیا جاتا ہے کہ کون کتنا کام کرتا ہے، کس درجہ ہنر و سلیقہ کا ثبوت دیتا ہے اور اس کے بعد ترقی کے دوسرے مرحلہ میں جب اشتراکی معاشرہ استواری و استحکام کی خاص نہج پر پہنچ جاتا ہے تو معاوضہ کا اصول یہ قرار پاتا ہے کہ ان لوگوں کی جسمانی، طبعی، تعلیمی اور تہذیبی ضروریات کا کیا تقاضا ہے۔ اس کو پورا کیا جائے۔ نظامِ اشتراکیت میں چونکہ سرمایہ کو مکمل منصوبہ بندی کی روشنی میں خرچ کیا جاتا ہے اس لیے مزدوروں اور کسانوں کی فلاح و بہبود کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ ریاست کی دوسری اہم ضروریات کیا ہیں اور اس مناسبت سے ان ضروریات کے لیے بھی رقم مختص کی جاتی ہے۔ اس احتیاط کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اشتراکیت اپنے ارتقائی دور میں تضادات اور اقتصادی ناہمواری کی مصیبتوں سے بچ جاتی ہے اور پورا معاشرہ اپنے جلو میں تناسب اور توازن لیے ہوئے ایک ساتھ آگے بڑھتا ہے۔ اس میں یہ نہیں ہو پاتا کہ معاشرہ کا ایک قلیل حصہ تو تہذیب و شائستگی کے اعلیٰ معیار کا حامل ہو۔ اور دوسرا حصہ جو تعداد کے اعتبار سے اس سے کہیں بڑا اور اہم ہے ابتدائی ضروریات تک سے محروم ہو۔

(باقی آئندہ)

---